ساڑھی اور بلاؤز کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو صوفیہ نے ایک لمبی سانس لی۔ گرم استری کے قرب سے جو پسینہ اس کے چہرے پر اکٹھا ہو گیا تھا، اس نے پونچھا اور پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر ان وسوسوں کو جی سے نکالنے لگی جو بزدل مصاحبوں کی طرح ظلِ الٰہی کو ڈرا رہے ہوں۔

ساتھ والے کمرے میں ابا میاں نعیم کو بڑے زور و شور سے انگریزی پڑھا رہے تھے۔ ان کی گرجدار آواز بار بار صوفیہ کو سوچتے میں چونکا چونکا دیتی اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹ کے رہ جاتا۔ ٹھنٹھناتے برتن کی سی آواز میں بڑے دھوم دھڑکے سے بار بار ہجوں پر اصرار ہو رہا تھا اور بیچارہ نعیم منمنی سی آواز میں یوں الفاظ اگلتا کہ ساری اے بی سی ایک سے ہو کر رہ جاتے۔

صوفیہ نے نیلا خط تکیے تلے سے نکالا۔ بڑے اہتمام سے اس کی تہ کھولی اور اپنی سہیلی کا وہ خط پھر پڑھنے لگی جسے وہ صبح سے قریباً ہر پندرہ منٹ کے بعد پڑھ چکی تھی۔ لکھا تھا:

"تم خواہ مخواہ نیاز سے ملتے ہوئے بدکتی ہو۔ ارے بھئی کچھ بھی تو نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ـــــ واقعی! ـــــ"

خط بند کر کے اس نے سر جھکا لیا اور ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچنے لگی کہ سوچنے کے انداز بھی کتنے مختلف ہوتے ہیں اور ایک انسان کی پسند میں اور دوسرے کی پسند میں کیسے کڑے کوسوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ یہ اسی یاسمین کا خط تھا جس نے نیاز کی شادی کے دن سارا وقت اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکنے میں گزار دیا تھا لیکن جب صوفیہ کے منہ کا تالا اس بکواس سے نہ کھل سکا تو یاسمین نے سیدھے سبھاؤ کہا تھا:

"ارے نیاز کی بھی کوئی بات ہے ـــــ ایسے شخص تو فیشن کی کتابوں میں ماڈل ہوا کرتے ہیں۔ صوفیہ! مرد ہو تو ایسا ہو ـــــ ایسا ہو کہ ڈوگ لک دے سکے۔ سمجھیں!"

یک لخت برادے میں چنگاری پڑی اور صوفیہ نے زانو پہ ٹکے ہوئے سر کو اٹھا کر پوچھا:
"کیا معنی؟"
"ارے! ڈوگ ٹک نہیں سمجھتیں؟ کبھی دیکھا نہیں جنگلی کُتّے کس طرح رو ند کو نکالا کرتے ہیں؟ ــــ چاہے ڈبو میاں خارشی ہوں۔ ٹانگ میں لنگ ہو لیکن آنکھوں میں "آ آزما دیکھ" کی سی کیفیت ہوتی ہے لیکن تم کیا سمجھو گی ــــ نہیں جی تمہیں تو شیو شدہ دھوئے دھائے بڑے خوش وضع قسم کے معزز آدمی پسند ہیں جن کا رنگ سفید اور ہونٹ لڑکیوں کی طرح نازک ہوتے ہیں ــــ انہیں دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھنا پڑتا ہے کہ کہیں ہماری کسی حرکت سے ان کی پیشانی نہ بھیگ جائے ــــ ارے چھوڑ و ایسے لوگ کب ڈوگ ٹک دے سکتے ہیں؟"
"ڈوگ ٹک؟" اس نے پھر پوچھا۔
"سنو صوفیہ! میرا آدرشی مرد تو مجھے ہمیشہ سیڑھیاں اترتا نظر آتا ہے۔ لمبا تڑنگا ــــ جس کی گالیں نہیں بلکہ ابھری ہوئی ہڈیاں ہیں۔ کھپانچے ایسے چہرے پر سرخی مائل سانولی کھال تنی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے بڑے بڑے پیر بوٹوں میں گھدے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اترتا ہے بڑے طمطراق سے، بڑے عزم کے ساتھ ــــ میں سیڑھیوں کے نیچے کھڑی یوں محسوس کرتی ہوں کہ ہر قدم اٹھتا ہے اور میرے قد سے چند انچ کاٹ کر علیحدہ کر دیتا ہے۔ اس کی ناک اور ہونٹوں کے ارد گرد دکھائیوں ایسی لکیریں اور آنکھوں تلے کے حلقے اور بھی سیاہ ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اترتا اترتا چلا آتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے دو قدم رہ جاتی ہوں اور پھر بھی وہ رکتا نہیں ہے۔ اترتا نہیں ٹھہرتا نہیں۔ اسے میرے بالوں میں سجے ہوئے پھول اور جسم سے لپٹے ہوئے کپڑے نظر نہیں آتے ــــ فقط چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھیں سکڑ جاتی ہیں اور آنکھوں میں ابوالہول کی سی بے نیازی جھلکنے لگتی ہے ــــ اسے ڈوگ ٹک کہتے ہیں۔ جس طرح ڈبو میاں حریص

ہوتے ہیں اور پھر بھی ان کی جنگلی جبلت پکار پکار کر کہتی ہے دُور پرے ہو — بس ایسے ہی جبڑے سخت کر کے آنکھیں سکیڑتے ہوئے میرا آدرشی مرد مجھے دیکھتا ہے اور کہتا ہے دُور پرے ہو۔"

"اور تمہیں غصہ نہیں آتا؟" حیران ہو کر صوفیہ نے پوچھا تھا۔

"غصہ — ارے غصہ ایسا غصہ — میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں غصے سے کانپنے لگتی ہوں اور میرا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ میں لٹکایا ہوا پرس اس کے سر پر دے ماروں لیکن وہ ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش سے مسکرا کر آگے نکل جاتا ہے۔ مجھے اس لمحے سمجھ نہیں آتی کہ اس کی آنکھوں کی حقارت اور لبوں کی ستائش کس ڈانڈے پر ملتی ہے۔ بس اس کے ہر قدم کے ساتھ میرا قد چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے کہ میں حقیر سی مکھی اور وہ بڑا سا خونخوار شیر ہے۔ اگر میں نے اپنا پرس اس کے سر پہ مارا بھی تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ مسکراتا ہوا آگے نکل جائے گا اور بس —"

"مجھے تو آدمی کی آنکھوں میں معصومیت کی طلب ہے"۔ صوفیہ نے نیصلہ کُن انداز میں بات کی۔

"معصومیت؟ یعنی ناتجربہ کاری! ارے کیوں معصومیت کی بھینٹ چڑھنے لگی ہو۔ ایسا انسان تو چاہے کتنے ہی مظالم توڑے اسے بالآخر معاف کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی میری جان صدقِ دل سے — اور کہیں ڈوگ ٹک دینے والا اگر دغا دے تو لطف ہی آجائے۔ ایک قسم کا تناؤ ہمیشہ باقی رہے گا کیونکہ اس کی ساری شخصیت تناؤ سے بنی ہے۔ ایسا تناؤ نہیں جو اُسے دیکھ کر میں محسوس کرتی ہوں بلکہ وہ کھینچ کی سی کیفیت جس سے اس زمین کے سارے عناصر آپس میں پیوست ہیں — اور تمہارے فیشن بک کے ماڈل صاحب تو دوسرے دن ہی بھول بھال جائیں گے بالکل —"

صوفیہ نے سر جھکا لیا اور اپنے آپ سے بولی — "نہیں یاسمین! بھلا دینا کچھ ایسا

آسان بھی نہیں ہوتا جیسا تم سمجھتی ہو۔"

چھنک سے پاس والے کمرے میں بتی جلی اور منّی نے ریڈیو کے کان اس زور سے مروڑے کہ چند لمحے تو ابا بھی ہیجے کرانا بھول گئے۔

فرمائشی پروگرام تو دیر ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ اب تو وہ ریکارڈ بھی سنائی دینے بند ہو گئے تھے جو پان والے کی دکان سے پکار بن کر اٹھ رہے تھے۔ ابا میاں کے کمرے کی بتی بجھ چکی تھی اور ان کے خراٹے بلند ہو رہے تھے۔ منّی کے کمرے میں ابھی تک روشنی تھی لیکن لگتا تھا کہ وہ اپنے ٹسٹ کے لیے پڑھتی پڑھتی کتاب پہ جھکی سو چکی ہے۔ سارے گھر پر خاموشی طاری تھی، صرف باورچی خانے میں نلکہ چل رہا تھا اور برتن گھسیٹنے اور مانجھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

صوفیہ کئی گھنٹے دائیں گال پر ہاتھ رکھ کر سوچتی رہی تھی۔ سامنے دیوار پر نگاہیں گاڑے گاڑے اب اس کی آنکھوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے رخسار سے چپکی ہوئی ہتھیلی اٹھائی تو گال میں عین آنکھ کے نیچے ٹیس سی اٹھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈریسنگ ٹیبل سے کریم کی شیشی اٹھائی اور ہولے ہولے اس سرخ حصے پر تھوڑی سی کریم ملنے لگی۔ پھر اس نے دوپٹے کے کونے سے ہاتھ پونچھ کر از سرِ نو لفافہ کھولا اور اس تحریر پر نظریں گاڑ دیں جو بغیر پڑھے ہی اس کے ذہن میں اپنا آپ دہراتی چلی جا رہی تھی ـــ یاسمین پر ایمان لاتے ہوئے اس نے اس کے الفاظ پڑھے:

"تم نے نیاز کی بیوی نہیں دیکھی ـــ ارے چھوڑو صوفیہ! ـــ تمہارے بعد اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے گرم گرم چائے کی پیالی کے بعد یخ بستہ حلق میں انڈیلنا پڑے ـــ بخدا تم نیاز سے ضرور ملو۔ ملنے والی بات ہی ہے۔ میری تمنا نہیں استدعا ہے۔ جانتی ہو یوں چھپ کر بیٹھ رہنے سے وہ کیا سمجھے گا؟ یہی کہ تم مارے رنج کے اندر ہی اندر گھلی مرتی ہو اور مارے شرم کے کسی کو

منہ نہیں دکھاتیں۔ سنو صوفیہ! نیاز سے ملنا ناگزیر ہے۔ پرسوں ہمارے ہاں اس جوڑے کا نزول ہو رہا ہے۔ تم یوں بن سنور کر آؤ کہ ایک بار تو نیاز بھی کلیجہ مسوس کر رہ جائے ــــ اور کچھ نہیں تو تم پچھتاوا بن کر ہی اس کے وجود سے چمٹ جاؤ۔ توبہ توبہ! یہ چپ کر زندگی بسر کرنا تو انتہائی بزدلی ہے"۔

صوفیہ نے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر چہرہ ان میں لے لیا اور ماتھے پر بے شمار بل ڈال کر سوچنے لگی، آخر یاسمین ٹھیک ہی تو کہتی ہے اور کچھ نہیں تو نیاز کے جی میں ہلکی سی کسک بن کر ایک بار پھر اٹھنا چاہیے ــــ وہ سال بھر کے وقفے میں کتنی بدل گئی تھی یہی نیاز تھا جس کے لیے وہ کبھی خیال میں بھی دکھ کا تصور کرنا نہ جانتی تھی اور یہی نیاز تھا، جس کے وجود کے ساتھ وہ گھن بن کر لپٹ جانا چاہتی تھی کیونکہ وہ سارے وعدے جو نیاز کے لبوں سے سرگوشیاں بن کر نکلے اس کے ذہن میں اب تک ہتھوڑے چلا رہے تھے۔ وہ ننھی منی شرارتیں اس کے لہو میں تحلیل ہو کر ابھی تک حرکت کرتی تھیں جو شرارتیں ہی تھیں فقط شرارتیں! ــــ اور وہ مبہم سی گرویدگی جو نیاز کیچلی کی طرح کب کا اتار چکا تھا۔ ابھی تک اس کی زیست کا حاصل تھی۔ وہ ساری باتیں اب قند و نبات نہ رہی تھیں بلکہ ان میں اب پچھتاوے، شرمندگی اور وسوسوں کا زہر مل گیا تھا اور جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ان باتوں کا کسیلا پن اس کی زندگی میں کڑوے دھوئیں کی طرح بل کھا رہا تھا ایسا دھواں جسے نکلنے کی راہ نہ ملے اور یہ سب کچھ برداشت کر لیا جاتا، سب کچھ سہہ لیا جاتا اگر صبح و شام صوفیہ کو یہ خیال نہ ستاتا کہ نیاز کی شادی اس کی اپنی پسند کی شادی تھی، اس میں اس کے ماں باپ کا دباؤ قطعی شامل نہ تھا۔

یاسمین کے خط کو پڑھ کر اسے بڑا حوصلہ ہوا اور وہ درد بھی بھول گیا جو دانتوں گال میں رہ رہ کر ٹیس لیتا تھا۔ اس نے نیاز کی بیوی سے متعلق جملہ بار بار پڑھا اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اس نے ساڑھی اٹھا کر اپنے چہرے کے ساتھ لگائی۔ بلاؤز کو

جانچا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر قمیص اتارنے لگی ـــــ اسے ریہرسل کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔

قدِ آدم آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر تو وہ متحیر رہ گئی۔ ساڑھی کی سلوٹیں اس کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں۔ پتلی سی تنگ کمر بلاؤز میں اور بھی گھٹ کر رہ گئی تھی اور بھرے بھرے کندھے نمایاں نظر آنے لگے تھے۔

اپنی شبیہ دیکھ کر اسے بھول گیا کہ ناک آگے سے پھیلی ہوئی ہے کیونکہ لپ سٹک کا رنگ ہی ایسا تھا کہ ناک پر نظر ہی نہ جمتی تھی اور گلے میں پڑی ہوئی کنٹھی ایسی تھی کہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ کندھے سر کے بہت قریب ہیں۔ گھنیرے بال سنور کر جوڑے کی شکل میں اس کی گردن پر کنڈلی مارے بیٹھے تھے اور آنکھوں میں چمک تھی گویا وہ آگ کے سامنے بیٹھی بڑی پُراسرار کہانی سُنا رہی ہو۔

صوفیہ نے ایک لمبی سانس لی اور اپنے جلتے رخساروں پر ہتھیلیاں جما لیں، دائیں گال میں ٹیس سی اٹھی لیکن اس نے بڑی بے پروائی سے کہا:

"نہیں یاسمین! میں ضرور آؤں گی۔ مجھے بزدل نہ سمجھو ـــــ میں اس بار ضرور آؤں گی اور جب نیاز آگے بڑھے گا تو میں سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی طرف ضرور دیکھوں گی۔ ایک ایسی نظر سے جس میں ہم جنم کی پیشکار ہوگی ـــــ"

ایسے ہی خیالوں میں الجھی ہوئی وہ رات دیر سے سوئی۔ صبح اس وقت آنکھ کھلی جب سورج کھڑکی میں سے جھانکنے لگا۔ منّی بغیر اس سے پوچھے اس کا دوپٹہ اوڑھ کالج جا چکی تھی۔ نعیم پپو کو سائیکل پر بٹھا بچوں کے سکول کو روانہ ہو چکا تھا اور ابا میاں ڈیڑھ گھنٹہ اپنی چھڑی ڈھونڈنے کے بعد خالی ہاتھ کچہری چلے گئے تھے۔ گھر میں خاموشی تھی لیکن آنگن میں جھاڑو دینے کی آواز آ رہی تھی۔

صوفیہ نے بڑی ملبی سی انگڑائی لی اور سامنے ٹنگی ہوئی ساڑھی کو دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور اٹھتے ہی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ رات والی کریم کی چکناہٹ ابھی تک چہرے پر موجود تھی لیکن غور سے دیکھنے پر اسے احساس ہوا کہ دائیں گال زیادہ سرخ تھی اور عین آنکھ کے نیچے یہ سرخی دھبہ بن چکی تھی۔ اس نے انگلی سے اس چٹاخ کو برابر کرنا چاہا لیکن انگلی کے دباؤ سے رخسار میں ایسا درد اٹھا کہ اس نے دبانا چھوڑ دیا اور منہ دھونے کے لیے غسلخانے کی طرف چل دی۔

منہ دھونے کے بعد جب اس نے دوبارہ دیکھا تو سرخی بڑھ رہی تھی اور ناک کی دیوار اور گال کی اترائی کے درمیان ایک پھنسی کا ابھرتا ہوا سر نظر آ رہا تھا۔ صوفیہ نے جلدی سے اس حصے پر کریم ملی اور دعا کرنے لگی کہ پھنسی شام ہونے سے پہلے پہلے دب جائے۔

چار بج چکے تھے۔ صوفیہ آف وائیٹ ساڑھی پہنے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ کپڑے ویسے ہی چمٹے ہوئے اس کے جسم کی خوبیاں اجاگر کر رہے تھے لیکن صوفیہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور وہ بار بار آئینے میں چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں پڑھنے والوں نے پھر اپنی پڑھائی شروع کر دی تھی۔ منی فارسی رٹے جا رہی تھی اور نعیم سر کو پنسل سے کھجلاتا ہوا فارمولوں کے حل سوچ رہا تھا۔ پھر منی نے پڑھتے پڑھتے یکدم پکارا:

"آپا اب جا بھی چکو۔ کب کا تانگہ کھڑا ہے۔"

صوفیہ آئینے پر جھک گئی۔ دائیں گال تمتما رہی تھی اور آنکھ تلے ناک کی اٹھان تک ایک زرد رو بدہیئت پھنسی نے یوں سر نکال لیا تھا جیسے پکی بھنڈی کا بیج چمک کر رہ گیا ہو۔ مارے کرب کے اب اس کی سرخ آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں اور دایاں رخسار کچھ یوں درد سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا کہ اس کے لب کے کونے مسکراتے سے نظر آتے تھے۔ اس نے تنگ نظروں سے شیشے میں اس ڈوگ ٹنگ کو دیکھا اور پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا،

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آپا — آپا —" پپّو نے کمرے میں وارد ہوتے ہوئے کہا۔

لیکن صوفیہ نے ہاتھ چہرے سے نہ اٹھائے۔

"یاسمین آپا کا فون آیا ہے دلدی آڈ —"

صوفیہ نے گھٹی گھٹی آواز میں منّی کو آواز دی۔ "منّی! یاسمین کو فون کر دو میرا سر درد کر رہا ہے میں نہیں آسکتی۔"

"آپی — آپی دی روتیوں رہی ہو —" پپّو نے پوچھا۔

ساتھ والے کمرے میں سے منّی بولی: "آپا تم آپی فون کر دیں پڑھ رہی ہوں اور باجی یاسمین بڑی لمبی باتیں کرنے لگتی ہیں۔"

پھر آموختہ رٹتی ہوئی اس کی آواز آئی:

"ہنوز چشمش نگراں است کہ ملک با دگراں است۔ ۔ ۔ ۔"

صوفیہ نے ساڑھی کے پلو میں منہ چھپا لیا۔ رات کا سارا حوصلہ آنسوؤں میں بہ رہا تھا اور منی کی آواز اسے یوں جھنجھوڑ رہی تھی جیسے رات کے اندھیرے میں شکستہ مقبرے کے موکھے سے کوئی کبوتر گر کر مرقد پہ پھڑ پھڑانے لگے۔

———

پیا نام کا دیا

نہ جانے کب سے قیصر کی بنیادوں میں پانی پڑ رہا تھا۔ دیکھنے میں تو وہ بڑا تنومند درخت نظر آتا تھا لیکن اندر سے مٹی پولی ہو گئی تھی اور کھوکھلی جڑوں کا مرکزِ ثقل بگڑ چکا تھا۔ درخت بظاہر سرو قد تھا پر ٹہنیوں کو اندر ہی اندر یہ پیام مل گیا تھا کہ کسی لمحے بھی درخت کا تناتیورا کر نئی کونپلوں سمیت زمین پر گر سکتا ہے۔

پیا کچھ ایسی غزال چشم نہ تھی۔ دراز قد بھی نظر نہ آتی۔ رنگت بھی عنابی شہابی نہ تھی لیکن برسن ہار بادلوں کی طرح اس کا وجود بڑے وعدوں کے ساتھ بھرا ہوا تھا ــــ وہ کب برسے گی؟ ــــ مینہ مسلسل ہو گا کہ کن من کن من جھڑی لگے گی ــــ خشک سالی سے چٹخے ہوئے بنجر علاقے پر شیتل پھوار بن کر گرے گی کہ ٹھہرے تالاب پر ان گنت بھنوروں کی شکل میں جذب ہو جائے گی؟

جس روز پہلی بار قیصر کے دل کو کھونچ لگی وہ ایک فیشن ایبل بیکری میں کھڑا تھا۔ سامان وہ زیادہ بندھوا چکا تھا اور پیسے اس کی ماما نے کم دیے تھے ــــ کیک پیسٹری کے ڈبوں پر نظر ڈال کر جب رازداری سے وہ اپنے بٹوے کے پرت کھولنے لگا تو اس وقت پیا شیشے کا وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی جس کی باہر والی طرف "پُش"

لگی تھا۔

اچانک کھڑکی کھل جانے پر ہوا کے جھونکے سے جیسے منہ سے ایک آہ سی نکلتی ہے ایسے ہی قیصر کے ہونٹوں سے بڑی ہلکی بڑی نامعلوم سی سیٹی نذرانے کے طور پہ نکلی۔

پیا کے لیے قیصر بجلی کا ایک کھمبا تھا جس میں اچانک شاں آڈھلے بتی جل گئی تھی۔

وہ لاپرواہی سے آگے بڑھی۔ کاؤنٹر پر ایک کہنی ٹکا کر اپنا چہرہ ہاتھ کے پیالے میں دھرا۔ ایک پاؤں زمین پر جمایا اور دوسرے پاؤں کے پنجے کو پیچھے کھڑا کر کے ہلاتی ہوئی بولی:

"کریم پف ہیں؟"

"جی ــــ کس قدر؟"

"کوارٹر پاؤنڈ ــــ"

قیصر پانچ پانچ دس دس روپے کے نوٹ اور ریزگاری جمع کرتا رہا۔ پھر اس نے بیک فورسٹ کیک واپس کر دیا کیونکہ سامان اس نے زیادہ پیک کروالیا تھا اور پیسے ماما نے کم دیے تھے۔

اس ساری کاروائی کے دوران وہ نیم جھکی مندی مندی سی آنکھوں سے پیا کو دیکھتا رہا۔ پیا نے شاکنگ پنک رنگ کا لبادہ نما کچھ قمیض کچھ فراک کچھ سکرٹ سا پہن رکھا تھا۔ لمبی ہیل والی کالی کورٹ شوز کے اندر شاکنگ پنک جرابوں میں دھاگے اکھڑ جانے کی وجہ سے لمبی ادھڑن بن گئی تھی ــــ کندھوں پر دوپٹہ نہ تھا۔ مندی رنگے سیاہ بالوں میں انگارہ سی چمک البتہ ضرور تھی۔

جب پیا کریم پف لے کر اور قیصر چار ڈبے اٹھائے بیکری سے نکلے تو قیصر نے پُش والا دروازہ کھولا۔ پیا کے گزرنے کا انتظار کیا۔ پیا نے مسکرا کر تھینک یو کہا اور سیڑھیاں اتر گئی۔ اس کے بعد وہ اپنی اپنی کار میں سوار ہو کر گاڑیاں بیک کرنے لگے،

کیونکہ سامنے سڑک کے عین وسط میں کوئی حرحاحرسی کا مارا اپنی سفید گاڑی پارک کر گیا تھا۔ کار بیک کرتے ہوئے قیصر نے پپا کی گاڑی کا ماڈل، کار کا نمبر اور گرون مرطی زائد لوٹ لڑکی کو دیکھا۔ مین سڑک پر پہنچتے پہنچتے سٹیرنگ کو پھیرنے والے قیصر کے ہاتھ بھیگ چکے تھے۔ ونڈ سکرین کے سامنے لگے ہوئے شیشے میں اب پپا کی کار نظر آتی تھی کیونکہ وہ پچھلے موڑ پر ہی مڑ گئی تھی۔ اب ان گنت کاروں کے باوجود قیصر کو سڑک خالی خالی نظر آئی۔

دل ہی دل میں قیصر نے سوچا، اِن لڑکیوں میں جانے خدا نے کیا خوبی رکھی ہے جب بھی یہ چاہیں، موسم بدل سکتی ہیں۔ سردیوں میں لُو چلنے لگے اور گرمیوں میں برف خانے جیسی سردی محسوس ہو۔ اندھیری رات جگمگا اٹھے اور پورن ماشی کی رات اندھی ہو جائے۔ وہ کار چلاتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اس کمزور جنس کو بنانے والے نے بڑا ہی طاقت ور بنایا تھا۔ دور بیٹھی عورت مرد کو ایسے کھینچ سکتی ہے جیسے لوہے چون کو مقناطیس ـــ کچھ اپنے آپ سے ناخوش اور کچھ اوپر والے سے گلہ گزار وہ گھر میں داخل ہوا۔

"اتنی دیر لگا دیتے ہیں لکو؟ــــ کچھ خیال نہیں ہے تمہیں اے لیول امتحان ایسے تو نہیں دے دو گے۔ سب تمہاری شکایت کرتے ہیں ـــ بڑا ٹائم ویسٹ کرنا آتا ہے تمہیں؟"

پیسٹری پیٹیز کے ڈبے اس نے خاموشی سے ماما کو پکڑا دیے۔ جب سے وہ شیو کرنے لگا تھا اس کے تعلقات ماما سے اکھڑ گئے تھے۔ کبھی دوستوں کے سامنے ماما مٹھار مٹھار کر باتیں کرنے لگتی ـــ کبھی پانچ دس مہمانوں کے سامنے شیم شیم والی گفتگو کے ساتھ اس کا دل چھلنی کر دیتی۔ جب وہ دل لگا کر پڑھتا تب بہت جھڑکیاں پڑتیں، جب پڑھنا چھوڑ کر سکواش کھیلنا شروع کر دیتا تو ماما پوری دلداریوں کے ساتھ اسے اپنے آپ سے باندھ لیتی۔ اس جھک جھکوری کی لمبی داستانیں ابو تک پہنچیں۔ ماما گھنٹوں اپنی سہیلیوں

کے ساتھ گگو کو ڈسکس کرتی ۔ روتی، قسمیں کھاتی، اپنے بال نوچتی ــــ ماما کو کہیں اندر یقین ہو چکا تھا کہ اس کا گگو نالائق ہے۔ وہ اپنے باپ کی طرح کبھی زندگی بنا نہیں سکتا اور جو ادبنا ٹارگٹ ماما نے قیصر کے لیے دل میں سوچ رکھا تھا اس تک پہنچ نہیں سکتا۔

پیا کو بیکری کی دکان پر دیکھنے کے بعد قیصر اپنے وجود کی جھڑن کے ساتھ گھر میں داخل ہوا کیونکہ سارا وجود تو وہ پیا کو نذرانہ دے آیا تھا۔ شاید یہ خبط آدھے گھنٹے کے بعد وی سی آر پر کوئی فلم دیکھتے ہوئے ختم ہو جاتا لیکن کبھی کبھی واقعات خود ہی سنگین شکل اختیار کر لیتے ہیں ــــ وہ مضمحل سا ننگے پاؤں قالین پہ پھر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ماما کی آواز تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کارڈلیس اٹھایا تو اس پہ دو سہیلیاں آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔ پیا کہہ رہی تھی:

"ملائے پتہ ہے آنٹی میرے لیے شاکنگ پنک سٹاکنگز لائی تھیں ــــ ایک تو سلی آج ہی پھٹ بھی گیا میں نے بیکری میں نوٹ کیا تھا ــــ ہاں بابا گئی تھی ــــ کریم پف لینے ــــ"

ان دونوں لڑکیوں کی کراس ٹاک پر اگر قیصر گزارہ کر لیتا تو شاید عافیت گزرتی لیکن وہ تو بیچ میں کود پڑا، اور آگ جس کو وہ سمجھتا تھا کہ سرد پڑ جائے گی اور بھڑکی۔ اب پیا اور وہ ٹیلی فونی دوست بن گئے۔ پہلے پہل تو پیا کی طرف سے فون آنے لگا۔ وہ بڑی منتوں سماجتوں سے نمبر پوچھتا لیکن کج رفتار نے کبھی اپنا نمبر نہ بتایا ہمیشہ یہی کہتی ــــ کبھی میں خود فون کروں گی۔

ان دنوں سارا وقت قیصر کا دل فون کی گھنٹی کے ساتھ بندھا رہتا۔ کہاں تو گھنٹی بجتی رہتی لیکن وہ قریب نہ پھٹکتا اور ماما غسل خانے سے چلاتیں ــــ "بھئی گگو! فون کیوں نہیں دیکھتے ــــ" وہ پھر بھی فون کی طرف نہ بڑھتا اور اب کارڈلیس ہی اس کے کمرے میں رہنے لگا۔ حتیٰ کہ نہاتے وقت بھی فون اس کے ساتھ جاتا۔ اس کی ... ش ہوتی کہ پیا رات کو فون

کرے لیکن پیا کہتی :

"بکو! میں رات کو کیسے فون کر سکتی ہوں۔ امی مجھے جان سے مار ڈالیں گی"۔

"اچھا رات کو ایک بجے —— تمہیں پتہ ہے میرے پاس ایک دیا ہے۔ میں نے اس کا نام پیا رکھا ہے۔ میں رات کو پورے ایک بجے اسے ٹیلی فون کے پاس رکھ کر جلاتا ہوں۔ جب تک وہ جلتا ہے میں جیتا رہتا ہوں —— جب وہ بجھنے لگتا ہے تو میں انتظار نہیں کرتا صرف جینا بند کر دیتا ہوں"۔

"ہائے نہیں۔ میں باجی کے کمرے میں سوتی ہوں —— میں رات کو فون نہیں کر سکتی —"

"چلو آج رات —— صرف ایک بار —"

ہوتے ہوتے رات کے پچھلے پہر لمبے لمبے فون ہونے لگے۔ آواز دونوں کی پیاری تھی اور دونوں یہی چاہتے تھے کہ تعریف اس آواز کی ہوتی رہے۔ ہولے ہولے ان فون کالز کی بدولت وہ ایک دوسرے کے یوں واقف بن گئے جیسے مدتوں ساتھ رہے ہوں۔ نہ تو پیا کا ارادہ قیصر سے ملنے کا تھا اور نہ شدید خواہش کے باوجود قیصر پیا کو ملاقات پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔

اپر کلاس کے نوجوانوں کی طرح قیصر میں بھی ڈنک نہیں تھا۔ وہ سانپ، بچھو، بِڑ یا سب کچھ تھا لیکن اس میں کاٹنے، خوشیانے، دھول دھپا مارنے کی صلاحیت نہ تھی۔ انگریزی زبان اور [illegible] نے اس کی بول چال میں ایک لاچاری سی پیدا کر دی تھی۔ ماما کے ساتھ صبح شام لاجواب کر دینے والی بحثوں نے اس میں گیلی لکڑی کا سلگاؤ پیدا کر دیا تھا جس قدر اسے پیول کی پر ُمعانی چان لیا تھی اسی قدر وہ اپنے آپ کو اس محنت کا نااہل پاتا تھا وہ اندر ہی اندر کہیں شاعر تھا۔ عاشق تھا۔ ناکام انسان تھا۔ وہ اپنی ماں کی آرزوؤں کو سمجھتا ضرور تھا لیکن دنیاوی طور پر کامیاب ہونے کی اس میں صلاحیت نہ تھی۔ الکوتا ہونے کی وجہ

سے وہ ماما کا کمر تکیہ تھا اور جانتا تھا کہ اگر دنیاوی ترقی کے اس زینے پر نہ پہنچ سکا تو ماما کھڑکی کھلوتی مر جائے گی لیکن گلے پڑنے کا سودا وہ کر نہ سکتا تھا۔ اسی لیے اب وہ پڑھنے بیٹھتا تو کاپیوں پر خوبصورت کٹے بالوں والی لڑکیوں کی تصویریں بناتا رہتا تھا جنھوں نے شاکنگ پنک سٹاکنگز پہن رکھی ہوتی تھیں۔ یہ تصویریں گونگی تھیں لیکن قیصر ان کی زبان سمجھتا اور بولتا تھا۔ کھڑکی میں کھڑے کھڑے ہوائی جہازوں کو دیکھنے کے بہانے وہ ایک آواز کے گرد بڑے بڑے خواب بُنتا رہتا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی اور آنکھوں میں خمار اتر آتا

یہی دن تھے جب وہ خود کلامی کا شکار ہوا۔۔۔

ہر وقت اس کے اندر بیٹھی ہوئی شاکنگ پنک لڑکی باتیں کرتی رہتی۔ وہ تار توڑ دیتا تو پھر فون کی گھنٹی بجنے لگتی اور وہ تمام سوال از سرِ نو پوچھے جاتے جن کا جواب دونوں جانب ازبر ہو چکا تھا۔

لیکن پیا کی احتیاط اور قیصر کی شرافت کے باوجود وہ دونوں ایک دن پھر سرِ بازار مل گئے۔ پیا آئس کریم کے انتظار میں تھی اور قیصر ماما کے لیے کچھ دوائیں خرید کر دکان سے باہر نکل رہا تھا۔

پہلی ہی نظر میں دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اپنی اپنی تربیت کی وجہ سے انھوں نے اس حادثے کو معمولی ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن اندر ہی اندر قیصر کو لگا جیسے جشنِ تاجپوشی میں اسے تخت پر بٹھایا جا رہا ہے ۔۔۔ پیا بلش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ قیصر ہکلانے کے موڈ میں نہ تھا۔ اس لیے پیا منہ پرے کر کے کون کھاتی رہی اور قیصر دکانوں کے بورڈ پڑھتا ہوا موسم کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ دونوں کے قدم گلبرگ کے اس بازار میں بیٹھ گئے ۔۔۔ پیا دل میں حیران تھی کہ وہ جسے معمولی ٹیلی فون دوستی سمجھتی رہی وہ تو ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج وہ نہیں جانتی ۔۔۔ قیصر سوچ رہا تھا کہ لڑکیوں

کے قدم لینے میں جو وقت وہ سمجھا کرتا تھا وقت کا وہی احساس تو اصل زندگی ہے۔

سپاہی ان گنت بار ٹریفک کے اشارے بدل چکا تھا لیکن وہ اپنی اپنی کار کی چابیاں ہاتھ میں لیے وہیں کھڑے تھے۔

قیصر نے کنکھیوں سے پیا کی جانب دیکھ کر سوچا کہ شکل تو اس لڑکی کی بڑی معمولی ہے تھریڈنگ کی وجہ سے جلد بھی خراب ہو چکی ہے۔ پھر میں یہاں کیوں اس ظالم مظلوم نما کے حضور کھڑا ہوں ـــــ پیا سوچ رہی تھی کہ اگر ابھی کالج کی کوئی دوست آ گئی اور مجھے قیصر کا تعارف کرانا پڑا تو کیا بات سیف رہ سکے گی؟

ان دونوں نے اپنے اپنے راستے جانے کی کوشش کی۔ وہ ایک کار میں ایک سمت پر تو جا سکتے تھے لیکن بالکل مختلف سمتوں کا سفر ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں کونسی قوت تھی۔ کیسی ملاشیری تھی۔ ایک دوسرے کے قرب کی کیسی پیاس تھی جو ان دونوں کو ریسٹورنٹ کے اندر لے گئی۔

آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرتے بڑا وقت گزر گیا۔ نہ ان دونوں میں سے کسی نے سامنے دھرے کوک کو ہاتھ لگایا نہ برگر کھایا اور دوائیوں میں سے بچے پیسے کاؤنٹر پر ادا کر کے قیصر گھر آ گیا۔

کہتے ہیں۔ پہلے پہل سیلاب محض انگلی بھر سوراخ کرتا ہے پھر سیسہ پلائی دیوار بھی کام نہیں آتی۔ اگر کسی طرح یہ ملاقات ہی نہ ہوتی تو شاید کچھ بچ بچاؤ ہو جاتا لیکن اب بھوسے میں تیل ڈال کر جتنی تیلی دکھائی جا چکی تھی۔ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ قیصر پرائیویٹ طور پر اے لیول کا امتحان دے رہا تھا۔ پیا تھرڈ ایئر میں تھی۔ وہ اکیلا ٹیوشن پڑھنے جاتا تھا۔ پیا تنہا کالج کے لیے روانہ ہوتی تھی۔ کچھ لوگ شاید یہ سمجھیں کہ اگر وہ دونوں تنہا باہر نہ نکلتے تو شاید معاملہ کچھ اور ہوتا۔ ان دونوں کو اگر ملنے ملانے نہ بھی دیا جاتا تو بھی دونوں طرف تراہ تراہ ہوتی رہتی۔

ماما بھی آخر ایک منصوبہ رکھتی تھی۔ اسے بھی اپنے واحد کرنکیلے کو کسی اونچی منزل پہ پہنچانا تھا۔ ایک روز ٹیوشن پر جاتے ہوئے قیصر کو ماما نے پکڑ لیا۔

"ککو ٹھہرو ___"

"جی ماما ___"

"مجھے جو بتاؤ گے سچ بتانا ___"

"جی ماما ___"

"تم سید آصف علی کی بیٹی سے ملتے رہے ہو ___ میری اجازت کے بغیر۔"

کسی نے قیصر پر ترپال ڈال کر اس پر رسی باندھ دی ___ اس کا دم گھٹنے لگا۔

"تمہیں پتہ ہے ان کا سٹیٹس کیا ہے؟ ___ تمہیں معلوم ہے تمہارے جیسے لڑکوں کو ان کا باپ چپڑاسی بھی نہ رکھے ___"

پہلی بار اس کے کانوں میں اپنی اسیری کی اصلی حالت کھلی ___

"تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر وہ لوگ مان جائیں ___ لیکن ان لوگوں کو منانے کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔ بننا پڑے گا۔ تمہارا خیال ہے ایک اے لیول کی تیاری کرنیوالے لڑکے سے وہ اپنی بیٹی بیاہ دیں گے؟ ___ تم عام زندگی میں ایک بڑے افسر کے بیٹے ہو لیکن ککو! وہ لینڈ لارڈ ہیں ___ کارخانے دار ہیں ___ کس مصیبت میں پھنس گئے ہو تم توجہ سے پڑھائی کرو ___"

قیصر نے جواب دینا چاہا۔ کچھ اپنی صفائی میں کچھ بیا کی سچائی میں لیکن اس وقت ماما نے کونے میں پڑا ہوا ریکٹ اتنی زور سے صوفے کے بازو پر مارا کہ ریکٹ کے عین درمیان میں پٹاخے کی آواز آئی اور جالی والا حصہ لٹک گیا۔

"تمہیں کیا پتہ امیرزادیوں کے پاس تمہارے جیسے کھلونے بہت ___ ماری تو میں جاؤں گی جس کا ایک ہی بیٹا ہے ___ ماری تو میں جاؤں گی قیصر ___"

ماما سر کے بال نوچتی، حلق سے اونٹ جیسی آوازیں نکالتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔
پہلی بار اس کی محبت کے شگوفے نے دنیا کی ہوا چکھی۔ اب تک وہ اندر کہیں کسی اندھیرے میں منی پلانٹ کی طرح پل رہا تھا۔ اب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ پیا کو پانے تک لمبی مسافت کیسے طے ہو گی جبکہ پڑھائی کا سفر وہ طے ہی نہیں کر سکتا۔ وہ تو سارا دن پیا کے ناخنوں، اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتا رہتا ہے۔ کان کی لو پہ بیٹھے ہوئے ٹوپس اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتے ـــ ہنستے سمے سامنے والے دونوں دانتوں کے بیچ کے شگاف میں سے جو خوش دلی مسکراتی ہے وہی اس کے تعاقب میں صبح و شام رہتی تھی یہ نہیں کہ وہ ٹیوشن پڑھنے نہیں جاتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ پہروں دروازہ بند کر کے کتابیں کھولے حروف کی چیونٹیاں نہیں دیکھتا تھا۔ پر کچھ لوگ اندر ہی اندر عاشق ہوتے ہیں۔ کیفیتوں میں رہتے ہیں ـــ دنیا کے اعتبار سے ناکام انسان ہوتے ہیں۔ جس روز ماما نے سکواش کا ریکٹ توڑ کر اپنے سر کے بال نوچے، اس دن کے بعد سے قیوم خوفزدہ ہو گیا۔ وہ پیا سے ملنے پر پڑھائی کو ترجیح دینے لگا۔ اس نے ٹیلی فون کی گھنٹی بھی سننے سے کئی بار دل میں انکار کیا ـــ لیکن اندر اتنی جو مکھی لڑائی لڑنے کے باوجود جو چیز اسے کاٹ رہی تھی وہ یہی تھی کہ آخر اس محبت میں جلنے، بھسم ہونے کا فائدہ؟ ـــ وہ بھلا سید آصف علی کی بیٹی کو کیا دے سکتا ہے؟ ـــ محبت کا منی پلانٹ دنیا کی دھوپ کب تک برداشت کر سکتا ہے؟ وہ عجیب مخمصے میں پھنسا رہتا ـــ دل پر محبت کی بالادستی تھی۔ پڑھائی پہ ماما کا راج چلتا تھا۔ باپ سے وہ یونہی پیار کرنے کا عادی نہ تھا۔ کبھی آٹھ آٹھ گھنٹے پڑھتا رہتا کبھی تین تین دن کتاب کو ہاتھ نہ لگاتا۔ ہر بار نیا ٹائم ٹیبل بنتا، نئی قسمیں کھائی جاتیں لیکن پروگرام پہ عمل کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ان ہی دنوں سب وہ اپنے بھانویں پیا نامی براؤن لڑکی کو بھلا چکا تھا وہ اسے اچانک فائن وڈیو شاپ میں مل گئی۔ پیا کاؤنٹر پہ کھڑی کہنی رکھے، ہاتھ کے پیالے میں چہرہ

جمائے، ایک پاؤں فرش پر جما کر دوسرا پیر پنجے پر اٹھائے کھڑی تھی جب قیصر کچھ فلمیں واپس کرنے وڈیو شاپ میں داخل ہوا۔

"ہائے تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ ــــ" پیا نے سارے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"میں ــــ؟ کچھ نہیں ــــ"

"میں تمہارے جیسے لڑکے کے منہ پر تھوکتی بھی نہیں ــــ"

اس کے بعد قیصر اسے کہنی سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دکان کے باہر لے گیا۔ وہ دونوں پیا کی کار کے پاس پہنچے۔ پیا نے کئی بار کار سٹارٹ کی لیکن قیصر نے کار میں سے اترنے سے انکار کر دیا۔ قیصر نے بہت منتیں کر کے پیا کو منانے کی کوشش کی لیکن پیا نے من جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی ــــ جب دونوں طرف سے بہت گرمی سردی ہو گئی تو آخر پیا نے کہا:

"چلو گھر چلو ــــ ایک بار یہ ٹنٹا بھی ختم ہو کسی طرح تم شکل دکھاؤ باقی سب میں سنبھال لوں گی ــــ"

قیصر کے غبارے میں سے ساری گیس نکل گئی۔ وہ کار میں سے نکل کر ڈرائیور والے دروازے کی طرف آ گیا اور دونوں ہاتھ پیا کے کندھوں پر رکھ کر بولا:

"نہیں پیا ــــ میں تمہارے گھر نہیں آ سکتا ــــ سوری!"

"کیوں ــــ؟"

"مانا میرے ابو بہت بڑے سرکاری افسر ہیں ــــ لیکن ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ بنگلہ سرکاری ہے۔ کار سرکاری ہے ــــ اور میں ابھی اے لیول کا امتحان بھی نہیں دے پایا ــــ"

"میں انتظار کر لوں گی قیصر ــــ"

"کتنا انتظار ــــ کتنے سال ــــ کب تک؟ ــــ"

"جب تک تم کہو ــــ"

پیا کے ہونٹوں پر آنسوؤں کی آمد کے آثار تھے۔

"میری ماں مجھے کچھ بنانا چاہتی ہے ___ میں کچھ بن نہیں سکتا پیا ___"

"چلو میں گزارہ کر لوں گی کیکو ___"

"گزارہ کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا پیا ___ اور پھر میں کیوں تمہیں وہ تکلیفیں دوں جن کا ابھی تمہیں ٹھیک سے علم بھی نہیں ہے"

"اور کچھ نہ ہوا کیکو تو ہم زمینوں پر چلے جائیں گے کیکو ___ میری زمین ہم دونوں کے لیے کافی ہے ___"

"نہیں پیا ___ میں امی کے سوا کسی سے پاکٹ منی نہیں لے سکتا ___"

"تمہیں معلوم ہے کہ امی میری شادی کر دیں گی! ___ تم میرے ساتھ چلو ___ باقی میں سنبھال لوں گی قیصر ___ سب میری زبان سے ڈرتے ہیں ___ تم چلو تو سہی ___ سب جانتے ہیں جو میں چاہتی ہوں کر کے رہتی ہوں ___"

"نہیں ___"

"او جانے دو ___ مجھے پہلے ہی پتہ تھا ___ میرا دل کہتا تھا تم میرے ساتھ فلرٹ کر رہے ہو ___ مجھے پتہ تھا ___ جانتی تھی میں ___ کئی لڑکیوں کے ساتھ تمہارے افیئر ہوں گے ___ اپنی بلٹ میں ایک اور چھید ڈال لینا قیصر ___ ایک اور ہول ___"

بجلی کے کھمبے کا بلب فیوز ہو گیا اور وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا ___ پیا کے چہرے پر پتہ نہیں کب کے رُکے ہوئے آنسو بہنے لگے۔ اس نے دھکے سے گاڑی کو سٹارٹ کیا اور موڑ کاٹ گئی۔ پڑھنے کا جو تازہ تازہ عہد اس نے کیا تھا وہ اسی کار کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ہسپتال کی سیڑھیاں چڑھتے وقت قیصر کو علم نہ تھا کہ اتنی بڑی بات بھی ہو سکتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ پیا کے گھر والوں نے اسے ڈرانے دھمکانے، نوٹس دینے کے لیے ہسپتال

میں طلب کیا ہے۔ بھلا پیا جس کے درمیانی دو دانتوں کے بیچ خوش دلی رہتی تھی یوں اپنی جان لے سکتی ہے؟

لیکن جس وقت وہ پرائیویٹ کمرے میں داخل ہوا، کمرے میں دبی دبی سسکیوں کا شور تھا نہ جانے پلنگ کے اردگرد کون عورتیں تھیں لیکن جس لڑکی کو وہ جانتا تھا اس کے چہرے پہ چادر تھی اور پائنتی کمبل سے ایک پاؤں باہر تھا جس پہ شاکنگ پنک شاکنگز تھی۔

قیصر نے دونوں ہاتھوں میں اس پاؤں کو پکڑ لیا۔ سلیپنگ پلز نے اس جاندار پاؤں کو بھی ابدی نیند سُلا دیا تھا۔ پتہ نہیں کب سے قیصر کی بنیاد میں پانی گر رہا تھا۔ بظاہر تو وہ تنومند درخت تھا لیکن اندر سے مٹی پولی ہو چکی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سب کے سامنے وہ تیورا کر نہ گر پڑے۔

سرکاری گاڑی کی ونڈ سکرین پہ خزاں دیدہ پتے گر رہے تھے۔ کہیں سے برسن ہار بادل آسمان پہ اکٹھے ہو گئے تھے اور اکا دکا بوندیں بھی شیشے پر پڑنے لگی تھیں۔

قیصر سوچ رہا تھا کہ میں جو اپنی ماں کا کمر تکیہ ہوں، اس واقعے کے بعد میں اس ماں کے لیے کیا کر سکوں گا؟ جبکہ میں پیا کے لیے اس کے گھر تک نہ جا سکا۔

ونڈ سکرین اس کے آنسوؤں سے دھندلا رہی تھی۔ انگریزی زبان اور MARRIAGE نے اس میں ایک لاچاری پیدا کر دی تھی۔ ماما کی جھڑکیاں سہ سہ کر وہ بزدل ہو چکا تھا — پرائیویٹ کلینک سے بڑی دور آ کر اس نے گلوبکس کے اوپر دھرے ہوئے اپنے باپ کے سگریٹ کیس کو کھولا۔ پہلا سگریٹ سلگایا اور سوچا — بھلا میں پیا کے لیے کر بھی کیا سکتا ہوں جبکہ میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ پیا کا اصلی نام کیا ہے؟